نصر عباس نقوی

گناہ کی مزدوری

کتاب	:	گناہ کی مزدوری
مصنف	:	مرزا حامد بیگ
ناشر	:	ابلاغ اسلام آباد
طبع	:	اول ۱۹۹۱ء
صفحات	:	۱۹۲
قیمت	:	-/۱۰۰ روپے

مرزا حامد بیگ کا چوتھا افسانوی مجموعہ "گناہ کی مزدوری" ستمبر ۱۹۹۱ء میں سامنے آیا تو یونان کے مشہور ڈرامہ نگار یوری پیڈیس (EURIPIDES) (۴۰۶ ق۔ م تا ۴۸۰ ق م) کا ڈرامہ "میڈیا" (۴۳۱ ق م) کا خیال آگیا جس کی غیب گو کاہنہ 'اپالو دیوتا کے مندر میں بیٹھ کر غیب کی خبریں بتایا کرتی۔ جو کوئی بھی اس سے مستقبل کے متعلق سوال کرتا تو پہلے وہ کوئی نشیلا شربت پیتی' پھر لوبان سلگا کر اس کا دھواں سونگھتی اور پھر سوالی کو علامتی انداز میں اس کا جواب دیتی۔ مرزا حامد بیگ بھی پیش گویاں کرتا ہے لیکن لوبان کا دھواں سونگھ کر نہیں۔

میں اور مرزا حامد بیگ اورینٹل کالج لاہور میں اکٹھے تھے۔ یہ ۷۳۔۱۹۷۲ کا زمانہ ہے۔ مرزا سے جب بھی گفتگو ہوتی تو مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ SENATIONED THOUGHT کو جان بوجھ کر تجریدی رنگ دینے کی کوشش کرتا ہے تاکہ لوگ اسے ایک ایسا مفکر سمجھیں جس کے ہاں FACULTY OF IMAGINING کا بہت بڑا ذخیرہ ہو۔ اس کا تصور نہ تو ٹیڑھا اور نہ ہی مستقیم راستہ اختیار کرتا اور اس کی ذہانت معین سے غیر معین کی طرف سفر کرتی رہتی۔ میرا خیال ہے کہ شاید وہ اس وقت اپنے ہی افعال کے دائرے میں پھرتا رہتا تھا یا اسے اس کی PRIMITIVE DESIRE بے چین رکھتی تھی کہ اس نے کچھ کرنا ہے۔ مرزا حامد بیگ کے افسانوں پر تنقید کرنا میرا ہرگز مقصد نہیں بلکہ میں تو ان افسانوں کے ذریعے اس حامد بیگ کو تلاش کر رہا ہوں جو یونیورسٹی اور اینٹل کالج لاہور میں پڑھتا تھا اور جسے تجربوں پر بھی اعتبار نہیں تھا۔ جوجوان ہو کر ڈاکٹر حامد حسین اور پھر مرزا حامد بیگ ایک بہت بڑا افسانہ نگار بن گیا۔

لوول کا کہنا ہے کہ کسی ملک کی حکومت کو جاننے کے لئے صرف اس کے اداروں کی ظاہری شکل و صورت دیکھ لینا کافی نہیں ہے بلکہ یہ جاننا بھی ضروری ہے کہ پورے نظام پر کس طرح سے عمل ہوتا ہے اور

وہ عوامل کونسے ہیں جن کے تحت وہ حکومت چل رہی ہے لہٰذا یہ ضروری ہے کہ عوام الناس کے کردار، عادات اور سابقہ روایات پر گہری نگاہ ڈالی جائے۔ (۱)----- چنانچہ "گمشدہ کلمات" افسانوی مجموعے کے کرداروں کا جائزہ لیتا ہوں تو یہ سارے کردار مجھے جبر برداشت کرتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے ہونٹ کسی قسم کی فریاد اور احتجاج سے محروم ہیں۔ شاید اس کی وجہ مرزا حامد بیگ کے مغلیہ خاندان کا وہ تاریخی خوف ہے کہ دارا شکوہ کی طرح کہیں ان کی بھی آنکھیں نہ نکال دی جائیں۔ چونکہ اس کی تاریخ ایک لہو بھری داستان ہے لہٰذا وہ جگہ جگہ بلکہ بار بار اپنے تاریخی خوف اور خون آلودہ خاندانی کہانیوں کی وجہ سے مغل تلازمے استعمال کرتا ہے۔ درحقیقت مغل تہذیب کسی سماجی، مذہبی یا معاشی انقلاب کی مرہون منت نہیں تھی اور نہ ہی اس نے برصغیر کے سماج میں کوئی تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ البتہ مغلوں نے اس زنگی سماج اور تہذیب کو ضرور اپنا لیا۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا حامد بیگ میں اپنے پرکھوں کے نقش قدم پر چلنے کی معذرت خواہانہ آرزو ملتی ہے۔ جس کے اظہار کا وہ کوئی موقعہ ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔

مرزا حامد بیگ کے افسانے مجھے دھند میں چھپا ہوا ایفل ٹاور دکھائی دیتے ہیں۔ غیر واضح اور دھندلے۔ ہاتھوں تو پکڑی کر جائے، دیکھوں تو آنکھوں کے سامنے پردہ سا آجائے۔ "گمشدہ کلمات" "تار پر چلنے والی" یا "گناہ کی مزدوری" ان تین افسانوی مجموعوں کے زیادہ تر افسانے "ذات" سے تعلق رکھتے ہیں۔ ذات سے میری مراد ہمارا اپنا جسم ہے جس کا کچھ حصہ آسانی سے ہمارے مشاہدے میں آجاتا ہے اور کچھ حصہ اوجھل رہتا ہے۔ پانی میں تیرتی ہوئی مرغابی کی طرح یا گرہن کے چاند کی مانند----- ایک آوارہ بادل کے ٹکڑے جیسا----- جو اپنی پلکوں سے درد کے آنسوؤں کو چرا کر بے آب زمین کو سیراب کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ ذوبتی شام کی سرگوشیاں سن کر روتا ہے اور کبھی چاندنی سے لپٹ کر مسکراتا ہے۔ وہ ایک بچے کی طرح لفظوں سے بہل بھی جاتا ہے اور پھر بہل کر رو بھی دیتا ہے لیکن لمحے اسے قید کرنے کیلئے کمربستہ رہتے ہیں۔ وہ جذبات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنے ہی پیدا شدہ خطرات سے گھبرا اٹھتا ہے اور ایک ایسے انجانے ساحل کی طرف ڈرتا ہوا بڑھتا ہے جہاں چار سو اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ ایسے میں وہ بے اختیار چلا اٹھتا ہے کہ اس کا ماضی اسے واپس کر دیا جائے۔ وہ ماضی، جو کفن کی طرح سادہ ہے لیکن اس کا ماضی اس سے بہت دور ہے۔ وہ بے بسی سے مڑکر دیکھتا ہے تو زندگی اسے خواب کی مانند نظر آتی ہے۔ گزرے ہوئے لمحوں کا ایک ہیولا اسے اپنی طرف بلاتا ہوا محسوس ہوتا ہے:

"آخر یہ ٹوٹ پھوٹ کب تک چلے گی، ایک وقت آئیگا جب۔ میں اس سے آگے سوچتا ہوں۔
ایسے لمحات میں میری بے نور پلکوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے"

(افسانہ: واپسی۔ مجموعہ: "تار پہ چلنے والی" طبع اول: ۱۹۸۳ء)

"وہ ازل سے اداس اور اکیلا تھا۔ اپنے آپ میں گم اور اکیلے پن میں مگن۔ اس نے دنیا کی طرف سے آنکھ بند کر لی تھی"

(افسانہ: "ایک خاکی کا معراج نامہ" مجموعہ: "تار پہ چلنے والی")

اکلاپا ایک آفاقی سچائی ہے، جو انسان کی پیشانی پر روز ازل سے رقم ہے۔ جان ملٹن کہتا ہے: "WE MILLIONS MORTAL LIVE ALONE" چنانچہ یہ ازلی اکلاپا جو مرزا حامد بیگ پر مسلط ہے، اسے خود کلامی پر مجبور کر دیتا ہے۔ یونان کے سات دانشوروں میں سے ایتھنز کے دانشور سولن

(SOLON) کا کہنا ہے کہ "اپنے آپ کو پہچانو" لیکن اپنی پہچان اسی وقت ہو سکتی ہے جب لکھاری کسی عظیم تجربے سے گزرتا ہے۔ مرزا حامد بیگ طبقاتی نظام کے اس تجربے سے گزر کر انسان کے وجود کا احساس کرتا ہے اور اپنے آپ کو پہچان کر فرد کے احساس کو بھول جاتا ہے۔ امراء القیس جب اپنے باپ حجربن عمرو کندی کے قتل کا بدلہ لینے کیلئے یمن سے نکلا تو اس نے رسم کے مطابق تین تیر توڑ کر استخارہ لیا مگر ہر دفعہ یہی استخارہ نکلا کہ انتقام ترک کردو۔ اسے دیوتا پر سخت غصہ آیا اور تیروں کے ٹکڑے دیوتا کے منہ پہ مار کر بولا۔ "لعنت ہو تجھ پر۔ اگر تیرا باپ قتل ہوتا تو تو مجھے ہرگز منع نہ کرتا۔"

لیکن چونکہ اس میں لڑنے کی طاقت نہیں تھی لہٰذا وہ بدلہ لینے میں ناکام رہا۔ ہماری نسل بھی باپ کا بدلہ لینے میں ناکام ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام روزانہ حسینؑ کو قتل کرتا ہے اور روز نئی کربلا بناتا ہے۔ اسی لئے مرزا حامد بیگ کے ہاں بدلہ لینے کا جذبہ نہیں ملتا صرف ماضی کے سپنوں میں رنگ بھرنے کا ایک سراب ملتا ہے' آرزوؤں کے مرگھٹ میں اکیلی لاش کے جلنے کا احساس نظر آتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اس کے بازو طاقت ور نہیں جن سے وہ نئی دنیا تعمیر کر سکے۔

دنیا کا کوئی ادب ایسا نہیں جس پر مڈل کلاس کی اجارہ داری نہ ہو لیکن مڈل کلاس کا یہ المیہ ہے کہ اپنی بقا کیلئے اسے اپر اور لوئر دونوں کلاسوں سے رشتہ قائم رکھنا پڑتا ہے ان مڈل کلاسیوں میں کتنے واجد علی شاہ اختر ہیں اور کتنے وزیر آنا۔ شاید چند۔۔۔۔۔لیکن پھر بھی ہم کوئی سماجی تبدیلی لانے میں ناکام ہیں۔ مرزا کا افسانہ "اندر بوئی مشک مچایا" ہماری اس ناکامی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آج اگرچہ سرد جنگ کا اختتام ہو چکا ہے' دنیا میں طاقت کے سیاسی توازن ختم ہو چکے ہیں لیکن ہمارا معاشرہ سرمایہ دارانہ نظام کی آغوش میں گر رہا ہے۔ ریاست پر سرمایہ داری کے تفوق نے مزاج شاہی کی رعونت میں مزید اضافہ کیا ہے اور ان جذبات کا خاتمہ کر دیا ہے جس کی نقیب انسانیت دوستی ہے۔ افسانہ "بات" اسی افسرانہ بیوروکریسی کے شاہانہ مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔ سبط حسن اپنی کتاب "موسیٰ سے مارکس تک" میں لکھتے ہیں:

"معاشرہ جب طبقات میں تقسیم ہو جائے تو خیالات کی نوعیت بھی طبقاتی ہو جاتی ہے جس طبقے کا غلبہ معاشرے کی مادی قوتوں پر ہوتا ہے' اسی طبقے کا غلبہ ذہنی قوتوں پر بھی ہوتا ہے" (۴)

لیکن مرزا حامد بیگ کے افسانے بے بس اور پسے ہوئے طبقے کی ادھوری خواہش کے بے کفن ادھورے لاشے ہیں جن کی ہڈیاں ذرا سی جنبش سے رخ بدل لیتی ہیں۔ سڑکوں پر آڑی ترچھی لاشوں سے کھچی ہوئی لکیریں۔ جن سے مرزا حامد بیگ زمین کے ننگے سینے پر نئی کہانیاں بن رہا ہے۔ یہ ان گنت لکیریں جو اپاہج انسانوں کا اثاثہ ہیں جو "نیند کے ماتے" کی طرح فراق میں نڈھال' دکھی' ہر طرف اداسیاں بانٹتے پھرتے ہیں اور امن امن پکارتے ہیں۔

چہار جانب حیرت تھی اور وہ فراق میں نڈھال' دکھی ہر طرف اداسیاں بانٹتا پھر رہا تھا۔
اس نے یہ سب دیکھا اور امن امن پکارتا باہر نکل گیا۔ وہ جہاں سے اٹھا تھا' میز پر ایش ٹرے الٹی ہوئی تھی اور ادھ جلی سگرٹوں کے ٹکڑے ایک ترتیب کے ساتھ اوپر تلے چنے ہوئے تھے۔"

(افسانہ: "نیند کے ماتے" مجموعہ: "تار پر چلنے والی")

"افسانہ گناہ کی مزدوری" کا کردار ایک انوکھی سچائی ہے۔ ایک ایسا کردار جو زندگی کے اداس لمحوں کی آہٹ سے شکست خوردہ خواب لے کر نئی تمناؤں کو حوصلہ دیتا ہے اور ازل سے گردن میں طوق پہنے

مسافروں کی سیاہ قسمت کی مانگ بھر کر راستہ دکھاتا ہے لیکن یہ وہ راستہ ہے جس پہ سنگریزے پڑے ہوئے ہیں' ایسے سنگریزے جن کی نوکیلی کرچیں برہنہ پاؤں کو ڈس رہی ہیں۔ چاروں اطراف سے تیر آ آکر بدن کو چھلنی کر رہے ہیں۔ اس عالم میں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وقت کی خاموشی پکار پکار کر یہ کہہ رہی ہو کہ زمین پر گرنے والا لہو کا قطرہ تاریک وادی کے اونچے اونچے محلات میں جل اٹھے گا' مگر وہ مجرم جو اس شہر کے بلند و بالا سفید مکان میں رہ رہا ہے' بے گناہ لہو سے نئی زندگی کا غسل کرے گا کہ آؤ دیکھو! میں نے اسے صلیب دے دی ہے۔ تمام شہری رکوع میں جھک رہے ہیں اور صلیب کے بازو شمالاً" جنوباً" پھیلے ہوئے ہیں لیکن مصلوب کے سر سے لہو کے قطرے ٹپک ٹپک کر فضا کو مہکا رہے ہیں جبکہ ہماری چیخیں سوال بن کر ہمارے ہی ماتھوں پہ سج رہی ہیں۔ اس کا جواب صرف خموشی ہے۔ صرف خموشی جو آج بھی ہر لب پہ رقصاں ہے۔

اپنے اردگرد اگر نگاہ ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ سیاسی مصلحتیں قدم قدم پہ اپنا روپ بدل رہی ہیں اور ہماری نسل کا مفکر' ادیب یا دانشور حقائق کا اظہار کر کے اگر کسی راستے کی طرف اشارہ بھی کرتا ہے تو پھر بھی ہم آگے بڑھنے سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ آمریت کی نحاتی سوچیں ہمارا راستہ روک لیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نسلی' لسانی' معاشی' معاشرتی اور طبقاتی نظام سیاست نے ہماری ہر تمنا کو نگل لیا ہے' مذہبی تعصبات نے انسانیت کی اعلیٰ اقدار کو غیر اہم بنا دیا ہے۔ وہ لوگ جو اپنے آپ کو مذہبی روایات کا امین سمجھتے تھے بے گناہوں کو کانٹوں کا تاج پہنا کر خوش ہو رہے ہیں۔ منصور حلاج کے ٹکڑے کر رہے ہیں لیکن ان کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں۔ اس لیئے کہ وہ متبرک لوگ ہیں "گناہ کی مزدوری" ایسے ہی ماحول کے منہ پر ایک طمانچہ ہے۔

"حاکم نے لوگوں کے روبرو اپنے دونوں ہاتھ تسلے کے پاک پانی میں دھوئے اور کہا' لو اب میں اس راستباز کے خون سے پاک ہوا۔۔۔۔۔ تم جانو اور تمہارا ایمان' میں اسے تمہارے حوالے کرتا ہوں"

پروہت یک زبان ہو کر بولے: "اس کا خون ہم پہ اور ہماری اولاد پہ"

(افسانہ: "گناہ کی مزدوری" مجموعہ: گناہ کی مزدوری" مطبوعہ ۱۹۹۱ء)

"گناہ کی مزدوری" کے افسانے ایک بے نام سے احساس کی ایسی چیخ محسوس ہوتے ہیں جسے مرزا حامد بیگ اپنے سینے میں دبا کر رکھنا چاہتا ہے لیکن یہ چیخ ان گنت لمحوں کے ایک کرب مسلسل کو لیے نئے نئے چہروں' "سانڈنی سوار" "جنم جوگ" "اندھی گلی" اور "لاکرز میں بند آوازیں" میں ڈھل جاتی ہے۔ وہ ماضی کا آئینہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس آئینے کی کرچیں اس کی آنکھوں میں کھب کر اس کی بینائی کو پی جاتی ہیں اور وہ اپنی مجروح زبان اور بے بصر آنکھوں کو ساتھ لیے اس احساس کے تحت زندہ رہتا ہے کہ شاید اسے جینے کی اجازت مل جائے۔ "پھول بانٹنے والا" ایک ایسی تمنا کی کہانی ہے جو سسکتے نغموں کی آہ بن کر چشم کہر کے دامن میں چھپ گئی ہے۔ یہ حسین جذبوں کی آندھیوں کو موت دینے کی کہانی ہے۔ سانولے سپنوں اور خوش کن آرزو کو شکست دینے کی واردات ہے۔ مرزا حامد بیگ سوچتا ہے کہ کاش وہ بند دروازے کے پیچھے رہنے والے وجود سے بے خبر ہی رہتا اور اپنی نوک زبان سے صبحوں کے گرد پھیلی طویل راتوں کی تیرگی کو پی لیتا سماج کی وہ صدائیں جو بھیڑیئے کی غراہٹوں میں بدل چکی ہیں' انہیں اپنی محبت کی نغمگی میں بدل دیتا تاکہ جبر کا طلسم ٹوٹ جائے لیکن جب وہ اس کے اظہار کے لیے آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے تو دیکھتا ہے

کہ اس کی زبان پر خنجر کی نوک اور دہن پر ایک پاسبان کھڑا ہے۔ اس کے باوجود اس کا تصور صداقتوں کی گواہی کے لیے سب کچھ نظرانداز کر دیتا ہے۔

"اندھی گلی" زندگی کی کشمکش کا افسانہ ہے جس سے وہ باہر نکلنا چاہتا ہے لیکن عصر حاضر کے مسائل اسے مجبور کر دیتے ہیں کہ وہ اپنی مخصوص فضا میں رہ کر حقائق بیان کرے۔ یہ افسانہ زندگی کا وہ المیہ ہے جس کی اذیت سے مرزا حامد بیگ کا شباب دوچار ہے۔ "اندھی گلی" کے کرداروں کی روح پر چھایا ہوا مہیب سناٹا اسے نغمہ آلام جاں سناتا ہے جس کے زہر کی حدت سے وہ پگھل کر یادوں کے ہول خلم میں ڈوب جانا چاہتا ہے۔ تکمیل نمائی تعلقات اس کے بدن میں ہر لمحے نیا درد پیدا کر رہے ہیں۔ واقعات کا دہراوا اسے نہ تو تاریکیوں میں چین لینے دیتا ہے اور نہ ہی اجالوں میں اسے سکون کا کوئی گوشہ میسر آتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ آج کے افسانوں میں وہ معصومیت نہیں رہی جو قدیم افسانوں کا خاصہ تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے پرانے افسانہ نگاروں کے اذہان میں مستقبل کا کوئی مکمل نقشہ نہیں تھا۔ حکمرانوں، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں پر ڈھکے چھپے انداز میں تنقید کی جاتی تھی لیکن اس تنقید کے لیے عام طور پر مذہب کا سہارا لیا جاتا تھا۔ بسا اوقات یہ بھی ہوتا کہ ادیب، شاعر یا مفکر حکمرانوں کو ایک بہت بڑا مصلح بنا کر پیش کرتے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ کوئی سماجی تبدیلی آنا ناممکن ہو جاتی ہے۔ قدامت پسندی اور حصول معاش کے لیے زمین سے گہری وابستگی ہمارے ادباء کو مفلوج کر دیتی ہے جبکہ موجودہ دور کا ادیب اگرچہ اپنی زمین سے وابستگی تو رکھتا ہے لیکن وہ اس زمین پر بسنے والے انسانوں کے دکھوں کی نمائندگی کرتا ہے، زمین کے غم کا اظہار نہیں کرتا، زمین پر رہنے والے انسانوں کے غم کا اظہار کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حقائق کے اس اظہار نے ہمارے افسانے سے معصومیت چھین لی ہے اور وہ ان سچائیوں کی پہچان بن گیا ہے جو اپنے اندر خطرناک حد تک زہر رکھتے ہیں۔ اس کی دعائیں تیرہ بخت، اس کے سجدے بیکار اور اس کے سرمدی نغمے ایک سراب نظر آتے ہیں۔ اس کے آئینے ان تمناؤں کا مداوا کسی صورت نہیں بن سکتے اور وہ خدا سے سوال کرتا ہے کہ وہ کہاں جائے؟

مرزا حامد بیگ کے لیے اکیلے پن کے زنداں اور مہیب دیواروں سے باہر آنا ممکن نہیں لیکن اس کی تنہائی ایک ذات ہے جو نئی معنویت سے مشروط ہے۔ وہ حقائق اور صداقت کی جستجو کے لیے کوشاں ہے کیونکہ وہ پھر سے اپنی ذات کو متشکل کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح وہ اپنی ہی کہانی اور اپنے اندر کے جہنم کی کہانی سے نبرد آزما ہے۔ اپنی اکیلی قوت مدافعت کے بل پر اپنا راستہ آپ تلاش کرنے میں مصروف ہے۔ وہ اپنے مقدر کا خود مالک بننا چاہتا ہے۔ آج دنیا کی بساط سیاست میں تبدیلیاں آ چکی ہیں اور آ رہی ہیں۔ مختلف ریاستیں اور غلام قومیں آزادی حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ جب بھی کوئی شخص ان حالات کا تذکرہ کرتا ہے تو وہ ان تمام دلچسپیوں کو خارج کر دیتا ہے جو اس کی ذات کے ساتھ وابستہ ہوتی ہیں اس طرح وہ اجتماعیت کی بات کرتا ہے، یہی وجہ ہے کہ مرزا حامد بیگ کے افسانے صرف تجریہ نہیں بلکہ سوچے سمجھے تجربے ہیں اس کا تخیل، تخیل نہیں بلکہ سچائی ہے۔ وہ خود دیکھتا ہے، سوچتا اور پھر مشاہدہ کر کے لکھتا ہے:

"تمام شاموں میں شام آج ہی کی تھی اور اسے بستی سے دو کوس باہر کھلے میدانوں تک نکل جانا تھا۔ وہ راستے میں ہی ہانپ گیا۔ وہ کھلے میں رک گیا۔ اس کی دائیں ہتھیلی ابھی تک کان پر جمی ہوئی تھی اس کی نظریں ہر طرف کچھ تلاش کرتی تھیں۔ وہ اپنے دونوں پاؤں کی ایڑیوں پر بار بار

گھومتا' چند قدم چل کر رک جاتا اور اس کی آنکھوں میں پتلیاں بچپل سکڑ رہی تھیں۔ وہ ایک جگہ چند ساعتوں کے لیے بیٹھ بھی گیا۔

ہر طرف چپ چڑانگ تھی۔ ----کیا ایسا بھی ممکن ہے کہ وہ گھر سے نکلے ہی نہ؟"

(افسانہ "سونے کی مہر" مجموعہ "گمشدہ کلمات" مطبوعہ جنوری ۱۹۸۱ء)

مرزا حامد بیگ یونانی دیومالائی کردار ا یکٹی آن (Actaeon) کی طرح ہے جس نے آرٹیمس (Artemis) کو ننگا دیکھ لیا ہو اور جس نے غصے میں آکر اس کے پیچھے شکاری کتے لگا دیے ہوں۔ جو اسے شکار کرنے کے لیے ہر لمحے آگے بڑھ رہے ہیں۔ حامد بیگ نے بھی سماج کو اس کی فطری حالت میں دیکھ لیا ہے اور اس کے منافقانہ روپ کا اظہار کیا ہے۔ گوتم بدھ نے کہا تھا کہ ہر جاندار دکھ میں ہے۔ میں اسے روشنی دوں گا۔ سقراط آیا تو اس نے کہا کہ انسان سچائی کا متلاشی ہے' دانتے نے کہا کہ انسان انتشار کی آگ میں جل رہا ہے' ہیگل نے کہا کہ انسان حقیقت تک رسائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔ غرضیکہ جو آیا انسان اس کے ہمراہ چلتا رہا کہ شاید اس کے دکھ ختم ہو جائیں لیکن دکھ بڑھتے گئے' روشنی بجھتی گئی' بقول ہیڈگر "ہم رات میں ہیں' یہ وقت رات کا ہے اور اس کا خاتمہ ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔"

ماحول کی گھٹن' زندگی کی تلخیاں' تمدن میں تخریب کے بھڑکتے ہوئے شعلے' ہمارے عہد کی ایسی خصوصیات ہیں جنھوں نے ہمارے ذہنوں پر قبضہ جما لیا ہے جس سے روشنی ختم ہو گئی ہے۔ مکر و ریاکاری نے ہماری زندگیوں کو پرفریب بنا دیا ہے۔

"حضور مغل سرائے کی انتظامیہ اس سانحے کے وقوع پذیر ہونے پر سخت نادم ہے ہم خود حیران ہیں کہ پائیں باغ اور اس سے ملحقہ ملاقے میں جانے کیسے بچ بچ بھیڑیئے اور گیدڑوں کی ٹولیاں در آئی ہیں۔ حضور آپ کبیدہ خاطر نہ ہوں' مرحومہ کی مٹی عزیز کرنے کے لیے ہمارے عملے کو آپ بہت جلد سرگرم عمل دیکھیں گے۔ ہماری ہر ممکن کوشش ہو گی کہ آپ کے نقصان کی تلافی۔"

(افسانہ "مغل سرائے" مجموعہ: "گمشدہ کلمات")

آئی اے رچرڈز نے کہا ہے کہ "ہر طرف تبدیلیاں آ رہی ہیں اور یہ تبدیلیاں ہماری انفرادی اور اجتماعی زندگی کی نئی تشکیل کریں گی"(۳) مگر تیسری دنیا میں یہ تبدیلیاں نئے انداز سے وقوع پذیر ہو رہی ہیں۔ خلیج کی جنگ کے بعد امریکہ نے یہ چاہا کہ دیگر علاقائی قوتیں بھی ختم کر دی جائیں تاکہ کوئی بھی اس کے "نیو ورلڈ آرڈر" کی راہ میں رکاوٹ کا باعث نہ بنے۔ وہ تیسری دنیا کے ممالک کے اندر مختلف گروہوں کو اسلحہ پہنچا رہا ہے جس کے نتیجے میں غیرمستحکم حکومتیں اپنے استحکام کے لیے مختلف غیرانسانی حربے اختیار کر رہی ہیں۔ بے جرم و بے خطا انسانوں کو دار و رسن کی زینت بنایا جا رہا ہے۔ احساس محرومی سے آب حیات کی تشنگی بڑھتی جا رہی ہے۔ اسی وجہ سے سماجی نظام کی بنیاد ناانصافی بن گئی ہے۔ چنانچہ مرزا اپنے افسانوں میں مخصوص تہذیبی' سماجی اور ثقافتی پس منظر میں انسانی المیوں کا اظہار کرتا ہے۔ وہ اگرچہ اندھیروں میں رہ رہا ہے لیکن یہ اندھیرے داخلی اور خارجی دونوں کیفیات کا مظہر ہیں۔ موجودہ دور کے مخصوص نظام حیات نے افراد کو اجتماعی نقطہ نظر سے محروم کر دیا ہے جس کی وجہ سے بغاوت کی روایت پیدا ہو گئی ہے۔ نئی نسل کو ہولناک سماجی جرائم' ارباب بست و کشاد کی چیرہ دستیاں اور ظلم و ستم کی کہانیاں "داستان گو کہتا ہے" کے حوالے سے

مرزا حامد بیگ اپنے افسانوں میں بیان کرتا ہے اور یہ احساس دلاتا ہے کہ یہ ذرے کہیں ستاروں سے انتقام نہ لینے لگ جائیں۔

پہلے بھی میں نے کہا ہے کہ مرزا حامد بیگ کے افسانے "خود کلامی" "Soliloquy" کا انداز رکھتے ہیں یہ "Soliloquy" دراصل تنہائی کے عذاب سے پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ مرزا حامد بیگ کے اپنے اندر اور اس کے زندہ ماحول پر تاریکی مسلط ہو چکی ہے لہٰذا وہ اس مجبوری کو شدت سے محسوس کرتا ہے۔ اس طرح اس کے ہاں خود کلامی کا انداز خودبخود پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اس کی بدولت سوتے جاگتے کی کیفیت سے گذرتا ہے "نتیجتاً" وہ اجتماعی زندگی کے مسائل کو ایک نئے انداز سے دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ حالات نے زندگی اور اس کے وسائل کو مخصوص طبقے کے چند افراد تک محدود کر دیا ہے۔ اس کیفیت کو بدلنے کے لیے وہ انسانیت کی بنیادوں پر ایک نئے نظام کی تعمیر چاہتا ہے۔ چنانچہ اس رجحان کے تحت لکھے گئے افسانوی مجموعے "تار پر چلنے والی" میں ایک نئی دنیا نظر آتی ہے۔

بے شک جو چیز ہماری موجودہ نسل کی روح کو مردہ بنا رہی ہے وہ بے حسی ہے۔

مرزا حامد بیگ اس بے حسی کو شدت سے محسوس کرتا ہے کہ قاتل کے ہاتھ میں خنجر ہے لیکن ہر طرف ایک سناٹا:

"میں تاریک سناٹے میں بھورے رنگ کے مسالے کے تڑخنے کی آواز سنتا ہوں جس سے اینٹیں ایک ہیں آخر یہ ٹوٹ پھوٹ کب تک چلے گی۔۔۔۔ ایک وقت آئے گا جب۔۔۔ میں اس سے آگے سوچتا ہوں' ایسے لمحات میں میری بے نور پتلیوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا ہے۔"

(افسانہ : "واپسی" مجموعہ : "تار پر چلنے والی")

موجودہ دور میں اگر کوئی ملک یہ چاہتا ہے کہ وہ مقامی وسائل پر بھروسہ کر کے ترقی کر لے تو ایسا ناممکن ہے کیونکہ مقامی وسائل سے بھوک تو مٹائی نہیں جا سکتی چہ جائیکہ ترقی۔ جبکہ پیداواری قوتوں کا مالک ایک مخصوص طبقہ ہے اور یہی طبقہ اپنے ہی ہاتھوں سے اپنے ہی لوگوں میں بھوک تقسیم کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورتحال میں یقیناً سماجی تبدیلی ممکن ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر عوام الناس کو نہ تو بنیادی حقوق ہی ملیں اور نہ ہی عزت نفس حاصل ہو تو یہ بھی تبدیلی کا اعلان ہوتا ہے لیکن اگر جیسا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ : "جبر کے ماحول میں پرندے بھی آشیانوں میں مر جایا کرتے ہیں۔"

تو ایسے ماحول میں انسان اپنی پہچان کھو بیٹھتا ہے' بلکہ پورا معاشرہ اپنے تشخص کو بھول جاتا ہے۔

"تار پر چلنے والی" مجموعہ کا افسانہ "رہائی" ایسے ہی حالات کی عکاسی کرتا ہے کہ کیا ہم واقعی اپنی شناخت کھو بیٹھے ہیں؟ کیا ہمارے سر ہمارے جسموں سے اتار لیے گئے ہیں یا ہمارے آقا نے لوہے کا طوق ہمارے گلے میں ڈال کر ہم پر اعتماد کا اظہار کیا ہے۔ اگر ان سوالات کو بین الاقوامی تناظر میں دیکھا جائے تو ان کا اثبات میں جواب ملے گا' من حیث القوم سرمایہ دارانہ نظام نے ہمارے سر جھکا دیئے ہیں' ہم سے ہماری پہچان چھین لی ہے اور ہم سپرپاور کا طوق غلامی پہن کر فخر محسوس کر رہے ہیں:

"میں کیسے پہچانتا' تمہارے سر جو نہیں تھا" سو میں نے تمہیں وہیں رہنے دیا اور ایک بار پھر نکلا اس وقت ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی اور ہوا بہت سرد تھی۔ ایک جگہ منہ کے بل گرا ہوا ہوں اور جب کیچڑ صاف کیا تو پتہ چلا' میرے چہرے کا ناک نقشہ وہیں کیچڑ میں رہ گیا' پھر پیش ہوا ہوں

تو حکم ہوا ہے کہ آزاد کر دیا جائے میرا نام نقش ہو نہیں گیا۔ کوئی ہے جو میرا نام لے کر پکارے۔"

(افسانہ : "رہائی" مجموعہ : "تار پر چلنے والی")

مرزا حامد بیگ کے افسانے انسانی دکھوں کا اظہار ہیں۔ اس کے ہاں رجائیت یا امید نظر نہیں آتی اور نہ ہی وہ صراط مستقیم دکھاتا ہے۔ وہ نظام کو بدلنا تو چاہتا ہے لیکن اس کے ہاں طریق کار مفقود ہے۔ اس کے ہاں زخم بھرتے نہیں ہوتے گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ اس کے ہاں حقیقت کی تلاش وحشت کی دریافت ثابت ہوتی ہے۔ وہ ہیراکلیز "ہراقلس" (Heracles) کی طرح ہے جس کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں اور وہ باوجود کوشش کے پرومیتھیس (Prometheus) کو رہائی نہیں دلا سکا لیکن اس کی قید پر افسوس ضرور کرتا ہے۔ چونکہ اس کے ہاں امید کم ہے لہٰذا وہ خواہش کو ایک حقیقت خیال کرنے لگتا ہے اس طرح وہ تھوڑی سی تسکین حاصل کر لیتا ہے۔ مرزا حامد بیگ کے افسانوں میں "زندگی" موت کی نفی نہیں کرتی بلکہ موت زندگی کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ بعد موت زندگی کا تصور ان کے ہاں افسانوی مجموعہ "گناہ کی مزدوری" کے صرف ایک افسانے "تیجے کی دال" میں ملتا ہے۔ ورنہ وہ یہی سمجھتا ہے کہ موت کے بعد زندگی کا آفتاب دوبارہ طلوع نہیں ہوتا۔ اس کے ہاں ظلم کو برداشت کر لینے کا تصور ملتا ہے ظلم کے خلاف بغاوت کرنے کا تصور نہیں ملتا زیادہ سے زیادہ اس کے کردار دبی دبی سی صدائے احتجاج بلند کر لیتے ہیں۔ وہ صرف گزرے ہوئے اس "کل" کا نوحہ پڑھتا ہے جو اسے طرح طرح کے عذاب دے گیا ہے۔ اس نے حقیقتیں چھین کر جھوٹے خوابوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ اس کے گلستانوں کے غنچے پژمردہ، اس کے نغمے روح سے خالی اور اس کے کردار موت سے خوفزدہ نظر آتے ہیں۔ اس لیے کہ مجموعی طور پر مرزا حامد بیگ کے ہاں زندگی کی نوید نہیں ملتی۔ گزرے زمانے پر پچھتاوا ملتا ہے، بشارتیں نہیں ملتیں۔

"گناہ کی مزدوری" ابلاغ، ۳۳ے آئی ٹین فور، اسلام آباد نے ستمبر ۱۹۹۱ء میں شائع کی ہے یہ مصور ایڈیشن ہے اور اس کی قیمت مبلغ سو روپے ہے۔

حواشی:

(۱) "Continental Government and Parties" از ... صفحہ ...

(۲) "... سے ... تک" از ... صفحہ ۹۳

(۳) "Science and Poetry" از آئی اے رچرڈز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شمارہ ۱۸
جلد ۵
سرما ۱۹۹۲ء

مدیرِ مسئول : غلام ربانی آگرو

مدیرِ منتظم : افتخار عارف

مدیرِ اعلیٰ : خالد اقبال یاسر

سہ ماہی
ادبیات